اسلامی تہذیب وتمدن میں اختراع اور تازہ کاری: عہدِ بنی عباس کا تجزیاتی مطالعہ

Innovation and Creativity in Islamic Civilization: An Analysis of Abbasids Period

پروفیسر ڈاکٹر محمد ضیاء الحق *
ڈاکٹر محمد ریاض محمود **

ABSTRACT

The Islamic civilization is pro-human, universal and unprejudiced in its approach and spirit. That's why, the Muslims adopted all the beneficial elements from the other pre-Islamic civilizations which were not contrary to the spirit of Islam. They adopted the policy of benefit from cultural heritages and keep their essential elements updated. Consequently, the useful elements of the Greek, Roman, Persian, Egyptian, Indian, Chinese and other important civilizations were adopted, updated and made part and parcel of Islamic civilization through process of innovation and creativity. The Abbasids era of this civilization played a key role in its promotion and integration. The adoption from a variety of local cultures brought about a great revolution in the Islamic Civilization. Educational institutions were established and the necessary measures were taken to contextualize and translate the arts and sciences from other cultures into Arabic.

The present research article has been written to meet the need of study of Abbasids contribution in cultural advancement in an innovative manner. The article proceeds with introduction, importance and background of the study. It is followed by description of fundamental concepts of Islamic civilization and its evaluation. The second part of the study explains factors behind the process of adaptation during the period of Bani Abbas. The third part of the study discusses various manifestation of civilizational adaptation from other civilizations and its innovation through adding creativity, while conclusion includes the outcome of the study.

Keywords: Abbasids, Cultural Advancement, Innovation, Islam, Islamic Civilization.

* ڈائریکٹر جنرل، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف گجرات، گجرات

۱-موضوعِ تحقیق کا تعارف، اہمیت اور پسِ منظر

انسانی تہذیب و تمدن مختلف اجزا کا ایک ایسا منفرد مجموعہ ہے جس میں مذہبی عقائد و افکار، عبادات وروحانیات، نظمِ اجتماعی، سیاست و معاشرت، علوم وفنون، زبان وادب اور تعمیر وترقی کے بہت سے دیگر عناصر شامل ہیں۔ فطری اُصول اور تاریخی شواہد سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مختلف تہذیبی عناصر کے ارتقا واستحکام اور اس ضمن میں تغیر وتبدّل کے شعوری مراحل کا آغاز نسلِ انسانی کے ابتدائی دور میں ہی ہو گیا تھا۔ ہر آنے والا لمحۂ انسانی فہم وشعور کے کسی نئے پہلو کی دریافت کا پیغام تھا۔ ارتقا کے اس رواں اور طویل سفر میں مختلف مذاہب، علاقوں اور اقوام سے وابستہ تہذیبوں نے اپنے اپنے فکر وفلسفہ کے مطابق متحرک و فعال کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں یونانی، رومی، ایرانی، افریقی، مصری، چینی اور ہندی سمیت بہت سی دیگر تہذیبوں کے مثبت اثرات کا اعتراف نہ کیا جائے تو ناانصافی ہو گی۔ انسانی سماج کے حُسن کا راز اس تاریخی حقیقت میں پنہاں ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تہذیب تاریخ کے کسی بھی مرحلے میں مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئی بلکہ مذہب اور حالات وواقعات کی تبدیلی کے علاوہ علمی جمود اور فکری انحطاط کی وجہ سے پسِ منظر میں چلی گئی۔ مختلف تہذیبوں کی مقبولیت اور اثر پذیری میں کمی کا ایک اہم سبب وہ تعصّب بھی ہے جو زمانہ، علاقہ، زبان، رنگ، نسل خصوصاً مذہب کی بنیاد پر قائم تصورات پر مبنی ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ میں اسلامی تہذیب وتمدن کا تجربہ منفرد خصائص کا حامل ہے۔ قدیم تہذیبوں کے کھنڈرات اور دیگر ثقافتوں کے اُن صالح عناصر کو مسلمانوں نے اپنی تہذیب میں پوری حکمت وبصیرت اور خوش دلی سے شامل کر لیا جو اسلامی تعلیمات کی اساس اور اس کی رُوح سے متصادم نہ تھے۔ اس اُصول کے تحت قبل از اسلام تمام تہذیبوں کے مثبت اثرات کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیا گیا، نیز اقوام کے درمیان تہذیبی روابط اور پُر امن بقائے باہمی کے لیے بامقصد مکالمہ کی راہ ہموار کی گئی۔ تہذیبی اخذ، تازہ کاری اور اختراع ودانش سے بھرپور حکمتِ عملی وضع کی گئی۔ اس صحت مند روایت کا ہی نتیجہ ہے کہ آج قدیم اور معاصر تہذیبوں کے بہت سے مفید وکارآمد عناصر اسلامی تہذیب و تمدن کے واسطے سے جدید معاصر تہذیبوں کا حصّہ بن چکے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی حیرت انگیز اُٹھان، ترقی، مقبولیت، وُسعت اور لچک پذیری کو اسی مخصوص پسِ منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن کی تشکیل و تنظیم کے لیے اساسی نظریات قرآن وسنت سے مأخوذ ہیں، ان نظریات کا اطلاق عہدِ رسالت اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں ہوا۔ عہدِ بنی امیہ میں اس نظریاتی اساس کی حامل تہذیب وتمدن نے بہت سے نئے تجربات کیے، یہ تجربات بڑی حد تک عرب دُنیا تک محدود تھے مگر ان میں حیران کن وُسعت اس وقت آئی جب ۱۳۲ھ میں خلافتِ بنی عباس کو مسلم دُنیا کا اقتدار واختیار حاصل ہو گیا۔ اس عہد میں مختلف تہذیبی حوالوں

سے وابستہ عرب، ایرانی، کرد، ترک، پٹھان، چینی اور ہندوستانی اقوام ایک ہی مرکزی خلافت کے تحت اسلامی تہذیب وتمدن کی ترقی میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی تھیں۔ اگرچہ حکمرانوں اور اکثریتی آبادی کا مذہب اسلام تھا لیکن عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بدھ مت، جین مت، آتش پرست اور پارسی مذاہب کے حاملین بھی اس کثیر الثقافتی مملکت کے شہری تھے۔[۱] مسلمانوں کی تاریخ کا یہی وہ قابلِ فخر مرحلہ تھا جب انھوں نے قدیم اور معاصر تہذیبوں سے اخذ و استفادہ کیا۔ مختلف اقوام کے علمی و فکری اثاثوں کی تحقیق و تنقیح کے لیے اقدامات کیے گئے۔ مختلف عُلوم وفنون کی کتب کو دارالخلافہ یعنی بغداد میں "بیت الحکمت" کے نام سے قائم عظیم الشان ادارے میں لا کر ترجمہ کیا گیا۔ یونانی، ایرانی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کی کتب کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔[۲] علم وحکمت سے وابستہ اس تیز رفتار سرگرمی نے مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کو بامِ عُروج پر پہنچا دیا۔ دیگر اقوام کے مذاہب اور تہذیب وثقافت سے ہم آہنگی اور اخذ و استفادہ کے بارے میں مسلمانوں کے رویے کو ایک عظیم اجتہاد قرار دیا جائے تو حقیقت کے عین مطابق ہو گا۔ یہی وہ اُصول ہے جو اسلامی روایات واقدار کو "قدیم" نہیں ہونے دیتا۔ اسلامی تہذیب میں موجود حرکت پذیری اور لچک کے یہی اُصول اس کی جدیدیت اور ہر عہد میں تازہ کاری کے ضامن ہیں۔

اسلامی تہذیب وتمدن کی تاریخ میں عہدِ بنی عباس کو امتیازی حیثیت حاصل ہے کیوں کہ اس عہد میں مسلمانوں کو مختلف شعبہ ہائے حیات میں مثالی غلبہ و تفوّق حاصل ہو چکا تھا۔ سینتیس عباسی خلفا(۱۳۲ھ تا۶۵۶ھ) نے انسانی معاشرت کے احیاء کے لیے متحرک و مؤثر کردار ادا کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کی بڑی بڑی تہذیبیں اور تمدن تباہ ہو چکے تھے۔ اس وقت اسلام کی صورت میں عرب کی سرزمین پر ایک نئی تہذیب نے جنم لیا۔ اس تہذیب کے دورِ عُروج میں بغداد، کوفہ، سامرا، بصرہ، دمشق، سمرقند، بخارا، رے اور قاہرہ جیسے شہر انسانوں کی توجہ اور دلچسپی

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں: احمد امین مصری، ضحی الاسلام، مترجم: عمر احمد عثمانی، دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، س۔ن، ص:۲۲-۱۸؛ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کا نظم مملکت، مترجم: مولوی علیم اللہ، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۵۸ء، ج:۲، ص: ۵۹۹-۵۹۸؛ عبدالرزاق کانپوری، البرامکہ، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص:۱۳۷؛ ڈاکٹر گستاؤلی بان، تمدن عرب، مترجم: سید علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص: ۷۰۴؛ سید سلیمان ندوی، عرب وہند کے تعلقات، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص: ۲۱۰؛ شبلی نعمانی، المامون، اسلامی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور ص:۱۶۰؛ ڈاکٹر عبدالجبار الجومرد، ہارون الرشید، مترجم: سید رئیس احمد جعفری، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۴، ص:۲۹۶

(۲) حاجی خلیفہ، کشف الظنون، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۶۰ء، ج:۲، ص:۲۷۹

کا مرکز قرار پائے۔ان عظیم الشان شہروں کی آبادی لاکھوں نفوس پر مشتمل تھی، درسگاہیں علم و عمل کے نور سے جگمگا رہی تھیں، صنعت ترقی یافتہ تھی نیز قصرِ خلافت اپنی شان وشوکت اور آرائش میں بے نظیر تھا۔[1] اس خوش حالی ،فراوانی، غلبے اور استحکام کا بنیادی سبب وہ ثقافتی انقلاب ہے جو اسلام کی نظریاتی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے عباسی دور میں مسلمانوں کے ہاں رُونما ہوا تھا۔اس انقلاب کی کامیابی اور رنگارنگی کا سہرا مسلم روایت میں موجود تہذیبی اخذ وعطا اور جدت پسندی کو اختیار کرنے کے جرأت مندانہ رجحانات کے سر ہے۔ان رُجحانات کی واضح نشان دہی عباسی عہد کے مختلف علوم ،نصابِ تعلیم ،طب، فنِ تعمیر، ادب، فلسفہ ،زیورات، پارچہ جات، قالین بانی، ہاتھی دانت کی کندہ کاری ، کھیل کود کے مشاغل ،شاعری ،موسیقی ،غذائیات، خطاطی ،مصوری ،سنگ تراشی ،گچ کاری، جلد سازی، پچی کاری، فرنیچر اور عطریات سمیت بہت سے دیگر مظاہر سے ہوتی ہے۔عہدِ بنی عباس میں تہذیبی اخذ واستفادہ اور تمدن کی تازہ کاری کے مختلف مظاہر کا مطالعہ و تجزیہ اسلامی تہذیب کے زوال اور مسلمانوں کے علمی انحطاط کے دور میں بہت اہم ہے۔اس قسم کے مطالعے سے ماضی کی بنیادوں پر حال کی زبوں حالی سے نکل کر مستقبل کے راستے پر سفر کیا جاسکتا ہے ۔اسی علمی وفکری، تاریخی و تہذیبی اور تحقیقی ضرورت کی تکمیل کے پیشِ نظر موضوع ہذا کا انتخاب کیا گیا ہے۔

۲-عہدِ بنی عباس میں تہذیبی اخذ واستفادہ کے اہم عوامل

عباسی عہد کو تاریخِ عالم میں بالعموم اور مسلمانوں کی تاریخ میں بالخصوص بڑی اہمیت حاصل ہے۔یہ عہد تہذیبوں کا سنگم تھا جس میں عرب وعجم کا امتزاج بھی تھا اور روم وایران کی خوب صورت آمیزش بھی۔[۲] اس تہذیبی وثقافتی تکثیریت کے بہت سے مذہبی، سیاسی، جغرافیائی اور نسلی اسباب و محرکات تھے مثلاً تاریخی اعتبار سے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عباسی خلافت کا قیام عجمی کوششوں کا نتیجہ ہے اور اکثر عباسی خلفا عجمی عورتوں کی اولاد ہیں ۔منصور(م۱۵۸ھ) کی ماں بربر،مامون(م۲۱۸ھ) کی ماں ایرانی،واثق (م۲۳۲ھ)، مہتدی (م۲۵۶ھ) اور منتصر (م۲۴۸ھ) کی مائیں یونانی، مستعین (م۲۵۲ھ) کی ماں سلاوی، مستکفی (م۳۳۸ھ) اور مقتدر (م۳۲۰ھ) کی مائیں ترک، ہادی (م۱۵۰ھ) اور ہارون (م۱۹۳ھ) کی ماں یمنی اور مستضی (م۵۷۵ھ) کی ماں آرمینیائی تھی۔[۳] اس تاریخی دور میں تہذیبی اخذ وعطا کے درج ذیل اہم عوامل سامنے آتے ہیں۔

---

1. Philip K. Hitti , *History of The Arabs*, (London: Macmillan, 1993), pp.425-429.

(۲) احمد امین مصری، ضحی الاسلام، ص: ۲۲-۱۸

(۳) احمد امین مصری، ضحی الاسلام، ص: ۳۱-۲۶

۲-۱ بین المذاہب تعلقات

تہذیبی ہم آہنگی اور باہمی اخذ واستفادہ کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ریاست میں بسنے والے مختلف المذاہب لوگوں کے تعلقات خوشگوار اور دوستانہ ہوں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ امن وسلامتی کے قیام اور ترقی وخوش حالی کے حصول کے لیے نہایت مثبت کردار ادا کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ذاتی کردار اس حوالے سے بڑا قابلِ تعریف ہے، آپ ﷺ کی تربیت کا ہی اثر تھا کہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مفتوح ایرانی قوم کے نظامِ حکومت و معاشرت سے رہ نمائی حاصل کی اور ایرانی سلطنت کے بہت سے اہل کاروں کو اپنے ہاں ملازمت فراہم کی۔ غیر مسلموں سے حُسنِ سلوک اور رواداری کی اس قابلِ تعریف روش کو عباسی خلفا نے جاری رکھا۔ اسی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ عباسیوں نے مختلف تہذیبوں سے استفادہ کیا۔ غیر مسلم اقوام نے بھی عباسی خلافت کے انتظام وانصرام میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ نتیجتاً مذہبی رواداری کو فروغ حاصل ہوا اور تمام اقوام کے حقوق محفوظ ہو گئے۔[(۱)] مختلف مذاہب کے تہواروں کو عزت واحترام کے ساتھ منانے کی روایت نے جنم لیا،[(۲)] مختلف مذاہب کے لوگ حکومتی عہدوں پر خدمات انجام دینے لگے،[(۳)] ان کو مذہبی آزادی حاصل تھی،[(۴)] ان سے مشاورت کی جاتی تھی، مذہبی پیشواؤں کا احترام کیا جاتا تھا، اس طرح عبادت گاہیں محفوظ ہو گئیں،[(۵)] اگرچہ حکومت کا سرکاری مذہب اسلام تھا اس کے باوجود اس میں غیر مسلموں کی اچھی خاصی تعداد آباد تھی اور ان کی عبادت گاہیں کثرت سے موجود تھیں۔[(۶)] انھیں اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی آزادی تھی، یہودیوں کے اداروں میں تالمود کی تعلیم وتدریس کو

---

(۱) الذہبی، شمس الدین، محمد بن احمد بن عثمان ابو عبد اللہ (م ۷۴۸ھ)، تذکرۃ الحفاظ، مترجم محمد اسحاق، اسلامی پبلشنگ، لاہور، س۔ن، ج:۲، ص:۲۲۵

(۲) ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کا نظمِ مملکت، ج:۲، ص: ۵۹۹-۵۹۸

(۳) عبد الرزاق کانپوری، البرامکہ، ص: ۱۳۷؛ ڈاکٹر گستاؤلی بان، تمدن عرب، ص: ۲۰۴

(۴) سید سلیمان ندوی، عرب وہند کے تعلقات، ص:۲۱۰؛ شبلی نعمانی، المامون، ص: ۱۶۰؛ ڈاکٹر عبد الجبار الجومرد، ہارون الرشید، ص: ۲۹۶

(۶) ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کا نظمِ مملکت، ج:۲، ص:۶۹۹

(۶) ڈاکٹر عبد الجبار الجومرد، ہارون الرشید، ص: ۲۹۶

بڑی شہرت حاصل تھی۔[۱] انہیں بھاری ٹیکسوں کے بوجھ سے آزاد رکھا گیا،[۲] سفارت کاری کے لیے آزادانہ اور احترام پر مبنی روایات کو فروغ حاصل ہوا اور بین الاقوامی تجارت کی راہ میں کوئی مذہبی تعصّب رکاوٹ کھڑی نہ کر سکا۔

عباسی عہد میں تہذیبی و ثقافتی اتصال اور امتزاج و ہم آہنگی کا اندازہ بغداد شہر کے بطور دار الخلافہ انتخاب اور اس کی تعمیر کے مختلف مراحل سے بخوبی ہوتا ہے۔ منصور نے پہلے پہل ہاشمیہ کو دارالخلافہ بنایا تھا۔ بعد ازاں اُس نے محسوس کیا کہ یہ جگہ سیاسی، دفاعی اور موسمیاتی اعتبار سے نامناسب ہے۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک بڑا دارالخلافہ تعمیر کرے گا جو اس کی وسیع سلطنت کے شایانِ شان ہو اور وہ خود کسی مناسب جگہ کا انتخاب کرے گا۔ دورانِ تلاش وہ بغداد پہنچا اور چند روز وہاں قیام کیا۔ اُس نے گاؤں کے آس پاس کے معززلوگوں کو مشاورت کے لیے بلایا۔ ان معززین میں نسطوری فرقہ کے عیسائیوں کا ایک پادری بھی شامل تھا۔ اُس پادری نے بغداد کی زرعی، جغرافیائی، تجارتی، دفاعی اور سیاسی اہمیت کو بہترین مثالوں اور دلائل کی مدد سے واضح کیا۔ منصور نے اس پادری کے وضاحتی بیان کو بہت پسند کیا اور اسی مقام پر دارالخلافہ کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا حکم جاری کر دیا۔[۳] اس مشاورت میں منصور کا ایرانی مشیر خالد برمکی، ایک زرتشتی نجومی نوبخت اور ایک یہودی نجومی مرو بھی شامل تھے۔[۴] یہاں نسل یا مذہب کے بجائے میرٹ کا لحاظ رکھا گیا۔ مسیحی پادریوں، زرتشتی نجومیوں، ایرانی مشیروں یا یہودی ماہرینِ فلکیات کی دانش و حکمت پر اعتبار کہا جائے، ثقافتی ہم آہنگی کہا جائے یا مذہبی عدمِ تعصّب کا نام دیا جائے، بہر حال عباسیوں نے دیگر مذاہب کے حاملین کی فہم و فراست سے استفادے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ عباسی خلفا اور دیگر معاشرتی طبقات کے اس مثبت رویے نے وسیع پیمانے پر تہذیبی اخذ وعطا اور ثقافتی اتصال کی راہیں ہموار کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخِ انسانی میں یہ عہد مذہبی برداشت اور پر امن بقائے باہمی کی علامت کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

۲.۲-فنِ ترجمہ کا ارتقا

اسلامی تہذیب نے قدیم اور معاصر تہذیبوں سے اخذ واستفادے کی ہر ممکن کوشش کی اورانسانی عقل ودانش کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے میں کسی مذہبی یا نسلی تعصّب کو آڑے نہیں آنے دیا۔ اقوامِ سابقہ کے تحریری

---

(۱) مصدر نفسہ، ص:۲۹۸

2. T.W. Arnold, *The Preaching of Islam* (Lahore: Muhammad Ashraf, 1976), p59.

(۳) ڈاکٹر عبد الجبار الجومرد، خلیفہ ابوجعفر المنصور، مترجم: رشید احمد ارشد، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص: ۳۳۰-۳۲۸

(۴) طارق فتح، اسلامی ریاست کا خواب، مترجم: ایم وسیم، مشعل، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص:۲۷۵

سرمائے کو عربی اور دیگر زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے۔ یہی علمی جدوجہد مسلمانوں میں فنِ ترجمہ کے آغاز وارتقا کا باعث بنی۔ ترجمہ سے دلچسپی کے مظاہر عہدِ رسالت، عہدِ خلافتِ راشدہ اور عہدِ بنو اُمیہ میں ہی نظر آنا شروع ہوگئے تھے، کیوں کہ بعض اہلِ کتاب عبرانی زبان میں تورات کی تلاوت کرتے اور مسلمانوں کے سامنے عربی زبان میں اس کی تشریح پیش کرتے۔[۱] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سُریانی زبان سے واقف تھے، وہ تورات کے سُریانی ترجمہ سے استفادہ کرتے،[۲] حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) کا اہلِ ایران سے رابطہ مضبوط ہوچکا تھا، ایرانی لوگ آپؓ کو اپنے بادشاہوں کے طریقہ ہائے سیاست سے متعلق مشورے دیتے تھے۔[۳] مشہور طبیب ابن اثال نے حضرت امیر معاویہؓ (م ۶۰ھ) کے لیے یونانی سے عربی زبان میں متعدد طبی کتب کے تراجم کیے۔[۴] مروان بن حکم (م ۶۵ھ) نے بصرہ کے فارسی الاصل یہودی طبیب ماسرجویہ سے طب کی ایک کتاب **اھرون الاسکندری المعروف بالکناش** کا سُریانی سے عربی میں ترجمہ کرایا۔[۵] حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (م ۱۰۱ھ) نے اہرن بن اعین کو ایک فارسی کتابچے کا عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔[۶] ہشام بن عبدالملک (م ۱۲۵ھ) کے ایک غلام سالم نے سکندر کے نام لکھے گئے ارسطو کے خطوط کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ہشام نے عجمی بادشاہوں کے سوانح حیات پر ایک ضخیم کتاب کے ترجمے کا حکم بھی دیا۔[۷] خالد بن یزید (م ۶۸۳ء) نے یونانی کتب کے عربی میں تراجم کرائے۔[۸]

---

(۱) شبلی نعمانی، الفاروق، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۴۹۸

(۲) حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاول پور، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۱۹۷۰ء، ص: ۳۰۹

(۳) شبلی نعمانی، الفاروق، ص: ۴۱۵

(۴) مولانا محمد عبدالرزاق کانپوری، البرامکہ، ص: ۲۲۲؛ شبلی نعمانی، مقالات، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی، ج:۶، ص:۴؛ عبدالمتعال الصعیدی، الوسیط فی تاریخ الفلسفہ، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، ص:۹

(۵) مولانا محمد عبدالرزاق کانپوری، البرامکہ، ص:۲۲۹؛ ابن ندیم الوراق، ابو الفرج محمد بن ابی یعقوب اسحاق، الفہرست، منشورات، آرام باغ، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص:۱۹۲

(۶) محمد السید نعیم، فی فلسفۃ الاسلامیہ، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، ص: ۱۲۲

(۷) شبلی نعمانی، مقالات، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی، ج:۶، ص:۸۷

(۸) ابن ندیم الوراق، الفہرست، ص:۳۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۴۱۹؛
Sarton George, *Introduction to the History of Scienc* (Washington: Carnegie Institution, 1927), V: I, p 492, 494, 499.

ترجمہ نگاری سے متعلق یہ خدمات انفرادی نوعیت کی تھیں مگر ترجمہ نگاری کو ادارہ جاتی انداز میں فروغ دینے کا سہرا عباسی خلفا کے سر ہی ہے۔ منصور نے سُریانی، عجمی اور یونانی کتب کے تراجم کرائے۔ان میں کلیلہ و دمنہ، اقلیدس، کتاب السند والہند، ارسطاطالیس کی فلسفیانہ کتب، بطلیموس کی کتاب مجسطی اور کتاب **الارتماطیقی** شامل ہیں۔ یہ ترجمہ شدہ کتب شائع کی گئیں اور لوگوں نے ان کتب سے علوم حاصل کیے۔[(۱)]

ترجمہ کی روایت کو مستحکم کرنے میں بیت الحکمت کا کردار بڑا نمایاں ہے جسے ہارون الرشید (م۱۹۳ھ) نے قائم کیا۔اس ادارے کو بین الاقوامی سطح پر لانے میں مامون کا کردار بڑا نمایاں ہے۔ یہاں مترجمین کی ایک بڑی جماعت بھرتی کی گئی جس کو شاہی خزانے سے ادائیگی کی جاتی تھی۔ شامی، یونانی، سُریانی، پہلوی، ہندی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کی کتب کے عربی میں تراجم کیے گئے۔[(۲)] ہارون کے عہد میں ہی تورات اور انجیل کا عربی میں ترجمہ ہوا۔[(۳)] مامون نے مترجمین کی خدمات کے صلے میں خزانوں کے منہ کھول دیے اور انہیں معاشی طور پر خوش حال کر دیا۔[(۴)] ایک روایت میں ہے کہ ہارون کے طبیب جبریل کی ماہوار تنخواہ دس ہزار درہم تھی۔[(۵)] ان مترجمین میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی شامل تھے۔ مسلم علما میں ابویحیٰ البطریق (م۱۹۱ھ /۸۰۶ء)، عمر بن فرخان طبری (م۲۰۰ھ / ۸۱۵ء)، یحیٰ بن البطریق (م۲۲۰ھ / ۸۳۵ء)، محمد بن موسیٰ الخوارزمی (م۲۲۹ھ)، یعقوب کندی (م۲۵۲ھ)، سہیل بن ہارون، سعید بن ہارون اور یوسف الناقل کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ غیر مسلم ماہرین میں یوحنابن بطریق (م۲۰۰ھ / ۸۱۵ء)، عبدالمسیح بن الناعمی (م۲۲۰ھ / ۸۳۵ء)، یوحنابن ماسوَیہ (م۸۵۷ء)، حنین بن اسحاق (م۸۷۳ء / ۲۶۰ھیا۲۶۴ھ)، ثابت بن قرۃ الحرانی (پیدائش ۲۲۱ھ /۸۳۶ء)، قُسطابن لوُقا (م۹۰۰ء)، یوحنا بن بختیشوع (م۲۹۰ھ /۹۰۳ء)، اسحاق بن حنین (م۲۹۸ھ)، جبریل بن بختیشوع اورابوسہیل فضل بن

---

(۱) المسعودی، علی بن الحسین ،مروج الذھب و معاون الجواہر، مؤسسۃ العالمی للمطبوعات ، بیروت، ۱۹۹۱ء، ج:۴، ص:۳۳۳؛ السیوطی، جلال الدین، تاریخ الخلفاء، مکتبہ رحمانیہ ،لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۳۸۸

(۲) حاجی خلیفہ ، کشف الظنون، ج: ۱، ص:۶۷۹

(۳) ڈاکٹر عبدالجبار الجومرد، ھارون الرشید، ص:۲۹۷

(۴) مولانا محمد عبدالرزاق کانپوری، البرامکہ، ص:۲۱۸۔۲۴۴

(۵) القفطی، جمال الدین ابی الحسن علی بن یوسف، تاریخ الحکماء، مکتبہ المشنی، بغداد مؤسسۃ الخانج، مصر، ۱۹۰۳ء، ص ۱۴۲؛ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (تاریخی حصہ دوم) ج:۲، ص:۱۱۲-۱

نوبخت کے نام اہم ہیں۔ (۱) عہدِ بنی عباس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے علمی تعاون نے دوستانہ اور ہمدردانہ تعلقات کو استحکام بخشا، اب مسلمانوں کی تہذیب صرف مسلمانوں ہی کی شناخت تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے نام لیواؤں میں یہودی، عیسائی، ہندو اور بدھ سمیت بہت سے مذاہب کے ماننے والے شامل تھے۔ ثقافتی ہم آہنگی اور تہذیبی اتصال کے لیے یہ ایک مثالی ماحول تھا جس میں مذہب، نسل اور علاقے کا کوئی تعصب شامل نہ تھا۔ تمام اقوام و مذاہب کے عُلوم وفنون انسانیت کا اجتماعی اثاثہ قرار پا چکے تھے، کسی بھی مذہب اور تہذیب کے بارے میں تحقیق و تنقید کرتے ہوئے جانب داری کا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم سے اخذ واستفادہ اور حصولِ درس کا یہ اجتماعی عمل نقالی نہیں بلکہ اجتہاد، اعلیٰ ظرفی اور انسانی عظمت کی دلیل قرار پایا۔ اس مخصوص پسِ منظر میں مسلمانوں کی فنِ ترجمہ کے ارتقا میں کی جانے والی جدوجہد کو تہذیبی اخذ وعطا اور تازہ کاری کی کوشش کے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کیا گیا ترجمہ صرف علم وفن کو ہی منتقل نہیں کرتا بلکہ اقوام کے درمیان بااعتماد تعلقات، افہام وتفہیم، انتقالِ ثقافت اور مکالمہ کی راہ بھی ہموار کرتا ہے۔

۲.۳- بین الاقوامی تجارت

عباسی عہد میں بپا ہونے والے ثقافتی انقلاب کا ایک اہم عامل "تجارت کے ذریعے بین الاقوامیت" ہے، عباسیوں نے مختلف اقوام تک رسائی کو اپنا اہم ترین ہدف خیال کیا، معروف مستشرق فلپ کے ہٹی نے تعمیرِ بغداد کے ثقافتی پسِ منظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس شہر کو عباسی خاندان کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور نے دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر اسی وادی میں تعمیر کرایا تھا جس میں دنیائے قدیم کے بعض زبردست اور عظیم الشان دارالسلطنت تعمیر کیے گئے تھے۔ منصور دجلہ کے ذریعے چین تک اپنے تعلقات وسیع کرنا چاہتا تھا، علاوہ ازیں وہ فرات کے ذریعے شام اور رقہ تک بھی رسائی چاہتا تھا۔ اس نئے مقام یعنی بغداد نے مشرق سے آنے والے خیالات کے راستے کھول دیے۔ یہی وہ مقام ومرحلہ ہے جہاں عربی اسلام کو ایرانی اثرات نے آن لیا۔ ایرانی القاب و آداب، ایرانی ازدواج اور ایرانی شاعری کا غلبہ ہو گیا۔ (۲) دولت کی ریل پیل اور عوامی خوش حالی کے باعث عباسی دور میں بین الاقوامی تجارت کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ بہت سے بازار بنائے گئے۔ عراق میں زیادہ تر مالِ تجارت ایسا تھا جو

---

(۱) ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء، بیروت، ۱۹۶۵ء، ص: ۲۸۱؛ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی (تاریخی حصہ دوم)، ص:۶: ص: ۱- ۱۱۲

(2) Philip K.Hitti, *History of The Arabs*, pp. 424-429.

بیرونی ممالک سے آتا تھا۔ چوں کہ یہ خلافت کا مرکزی صوبہ تھا، اس لیے سلطنت کے تمام صوبوں کی اشیااس میں صَرف ہوتی تھیں۔ شہروں میں ہر قسم کی چیز کے لیے الگ بازار ہوتا تھا۔ بغداد کے بازار ہر قسم کی عجیب وغریب اشیا کے لیے جو بیرونِ ممالک سے یہاں لائی جاتی تھیں، مشہور تھے۔ لیکن شہر بغداد کی خاص صنعت رنگین ریشمی کپڑے تھے۔اس کے علاوہ وہاں پردے، نقاب، عماموں کے لیے ریشم کا کپڑا اور ہر قسم کے رومال بھی تیار کیے جاتے تھے۔بصرہ میں مختلف قسم کے کپڑے بغیر صاف کیے ہوئے ریشم کے بُنے جاتے تھے۔اس شہر کے بازار میں خاص کر جوہریوں کی دکانیں بہت مشہور تھیں۔ جہاں ہر طرح کے نوادر فروخت ہوتے تھے۔ان کے علاوہ یہ شہر معدنی اشیا، کچی دھاتوں، سرمہ، زنگار، سیندور اور سنگِ مرمر کی بڑی تجارت گاہ تھا۔ یہاں سے کھجوریں، مہندی، کچاریشم، گلاب کا عرق اور عطر فروخت کرنے کے لیے بیرونِ ملک لے جائے جاتے تھے۔ کوفہ کھجوروں، عطر، بنفشہ اور ریشم کے کپڑے کی وجہ سے مشہور تھا۔ واسط میں باقلہ، مصری اور ایک قسم کی سوکھی مچھلی جسے ریشم کہتے تھے، کے بازار تھے۔ نعمانیہ میں کپڑا بکثرت تیار ہوتا تھااور یہ شہر ہر قسم کے اُونی کپڑے کے لیے مشہور تھا۔(۱)

بغداد کے بازاروں میں گہماگہمی کی ایک بڑی وجہ اس شہر کی میلوں لمبی گودی تھی۔ جس میں سینکڑوں جہاز اور سیر و تفریح والی کشتیاں کھڑی رہتی تھیں۔ اِن جہازوں میں چینی جہازوں سے لے کر مشکیزوں کی دیسی کشتیوں تک موجود ہوتی تھیں جن میں ہوا بَھر دی جاتی تھی۔ موصل تک ان کا سلسلہ بندھا ہوتا تھا۔ بازاروں میں چین سے چینی مٹی کا سامان، ریشم اور مشک، ہندوستان اور جزائرِ شرق الہند سے گرم مصالحہ، معدنی اشیا اور رنگ، ترکوں کے ملک وسط ایشیا سے لعل، یاقوت، نیلم، کپڑے اور غلام، اسکنڈی نیویا اور روس سے شہد، موم، قاقم، سنجاب اور سفید فام غلام اور مشرقی افریقہ سے ہاتھی دانت، سونے کی خاک اور حبشی غلام آیا کرتے تھے۔ چینی مٹی کے ظروف کی خرید و فروخت کا ایک خاص بازار بالکل الگ تھا۔ مملکت کے صوبوں سے مقامی پیداوار میں مثلاً مصر سے چاول اور غلہ، شام سے شیشہ، دھات کا سامان اور میوہ، عرب سے کمخواب، موتی اور ہتھیار، اور ایران سے عطریات اور ترکاریوں سے لدے ہوئے کارواں اور جہازی قافلے دارالخلافہ بغداد پہنچتے تھے۔ بغداد اور دوسرے برآمد کے مراکز سے عرب تاجر مشرقِ بعید، یورپ اور افریقہ کے کپڑے، جواہرات، فلزئی آئینے، شیشے کا سامان اور گرم مصالحہ جہازوں کے ذریعے بھیجا کرتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی تجارت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔(۲) اس تجارت کی وجہ سے نہ

---

(۱) جی۔لی اسٹرینج، جغرافیہء خلافتِ مشرقی، مترجم: محمد جمیل الرحمٰن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۰۴-۱۰۳

(2) Philip K.Hitti, *History of the Arabs*, pp. 297-331.

صرف بین الاقوامیت میں اضافہ ہوا بلکہ تہذیبی اخذ و عطا بھی ہوا۔ غیر ملکی مال نے مقامی منڈی پر اثر ڈالا اور اس کا نتیجہ تجارتی معاملات میں تازہ کاری اور جدّت کی صورت میں سامنے آیا۔

۴.۲- مختلف شہروں سے غیر مسلم علما، اطبا، معماروں اور مزدوروں کی خدمات کا حصول

عُلوم و فنون کی تدوین اور ان کے تراجم کرنے میں مختلف مذاہب کے حامل اہلِ فکر و نظر نے عباسی خلفا کا بھرپور ساتھ دیا۔ علاوہ ازیں غیر مسلم علما، اُمرا، اطبا اور ماہرینِ تعمیرات نے مختلف شعبہ جات میں بھرپور خدمات انجام دیں۔ یاد رہے کہ عبد اللہ السفاح نے آخری اُموی خلیفہ مروان ثانی کو جو شکست دی تھی اس میں عیسائی اُمرا بھی شریک تھے اور شعر و شاعری میں بھی مسلمانوں سے پیچھے نہیں رہے کیوں کہ شامی و مصری عیسائیوں کی مادری زبان بھی عربی ہی تھی۔ انھوں نے محکمہ تعمیرات میں بھی خدمات انجام دیں۔ بغداد میں تقریباً پچاس ہزار صنّاع تھے۔ ان میں عیسائی معماروں کی کثرت تھی اور عیسائی محلے آباد تھے۔ جہاں ان کے گرجے اور خانقاہیں باعثِ رونق تھیں۔ اتوار کے دن مسلمان بھی تفریحاً گرجوں کی طرف جا نکلتے تھے۔[(۱)]

عباسیوں کے دربار میں ہندو اور عیسائی اطبا کی بھرپور خدمات لی جاتی تھیں۔ جورجیس بن بختیشوع، جبریل بن بختیشوع اور بختیشوع بن جورجیس اس دور کے معروف عیسائی طبیب تھے۔[(۲)] فنِ تعمیر میں بھی عباسیوں نے غیر مسلموں کی خدمات سے بھرپور استفادہ کیا۔ نہ صرف نئی عمارتوں کے بنانے میں مفتوحہ اقوام کے مزاج کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا بلکہ عملاً تعمیراتی کام میں ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا گیا۔[(۳)] مختلف شہروں سے آئے ہوئے اور مختلف مذہبی پس منظر کے حاملین کی صلاحیتوں کو تمدنی ترقیوں کے لیے استعمال کرنا مسلمانوں میں موجود وُسعتِ نظری اور مختلف الخیال لوگوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے کی روش کی غمازی کرتا ہے۔ عہد بنی عباس میں ہونے والے تہذیبی استفادے میں بین المذاہب تعلقات، علمی و ثقافتی اور ادبی کتب کے عربی تراجم، بین الاقوامی تجارت اور سماجی و تعمیراتی شعبہ جات میں غیر مسلموں کی خدمات، ایسے عوامل نے اہم کردار ادا کیا۔ ان عوامل کی وجہ سے مسلمانوں کے دوسری اقوام سے بہتر اور سنجیدہ تعلقات استوار ہوئے۔ سیاسی استحکام، اقتصادی خوش حالی اور ثقافتی

---

(۱) عبد الرزاق کانپوری، البرامکہ، ص: ۱۳۷

(۲) عبد الرزاق کانپوری، البرامکہ، ص: ۲۳۳؛ رابرٹ بریفالٹ، تشکیلِ انسانیت، مترجم: عبد المجید سالک، مجلس ترقیِ ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۵۲

(۳) گستاؤلی بان، تمدنِ عرب، ص: ۷۰۴

امتزاج نے اخذ وعطا کے رویوں کو مہمیز کیا۔ ان سب کے نتیجے میں مسلمانوں نے نہ صرف دوسری اقوام سے بہت کچھ سیکھا بلکہ اپنی فکری پختگی کے ذریعے علوم وفنون میں تازہ کاری اور جدت کی راہ بھی اپنائی۔

۳۔عہدِ بنی عباس میں تہذیبی اخذ واستفادہ کے اہم مظاہر

عباسی عہد مسلمانوں کی عظمت وشوکت کا نشان ہے۔ وُسعت، دولت، تجارت، ترقی، خوش حالی، علم وہنر، امن وامان اور جدّت، اعلیٰ ترین تہذیب وتمدن کا وہ کون ساوصف ہے جو عباسیوں کے دارالخلافہ یعنی بغداد کی شان کو دوبالا نہیں کرتا تھا۔[1] اس شہر کی سیاسی عظمت واہمیت پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف مؤرخ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) نے لکھاہے کہ آستانۂ خلافت پر بڑی شان وشوکت والے فرمانرواسجدہ کرجاتے تھے۔ ضعیف سے ضعیف خلیفہ کے سامنے ویلم وسلجوق کا سر جُھک جاتا تھا۔ محمود غزنوی نے "یمین الدولۃ" کا فخریہ خطاب جس سے حاصل کیا تھا وہ بغداد کا ایک مسلوب الاختیارات تخت نشین تھا۔ ہزاروں شعرا، مجتہدین اور اہلِ فن دور دراز ملکوں سے آکر وہیں پیوندِ خاک ہوگئے۔[2] یہ وہ شہر تھا جہاں یونانی فکر وفلسفہ کے ماہرین، عرب وایران کے شعرا، ہندوستان کے پنڈت، عیسائی پادری اور مجوسی حکما، بیک وقت موجود رہتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی(م ۱۹۱۴ء)بغداد کی کیا خوب تصویر کشی کرتے ہیں:

وہ بلدہ کہ فخرِ بلادِ جہاں تھا ترو خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس میں عباسیّوں کا نشاں تھا عراقِ عرب جس سے رشکِ جناں تھا[3]

شام، عراق، مصر اور ایران کی فتوحات کے بعد اسلامی تہذیب کو بہت سے نئے تجربات کا موقع ملا۔ مسلمانوں نے ان عُلوم وفنون کو اختیار کرلیا جو ان مفتوحہ علاقوں کے لوگوں سے حاصل ہوئے تھے۔ عربوں نے ان ممالک کے ہنر مندوں اور معماروں سے نئے محلات ومساجد کی تعمیر کروائی۔ جامع دمشق کو تعمیر کرنے والوں میں ایرانی، رومی اور شامی معمار شامل تھے۔ ابوجعفر منصور کے دور میں بغداد شہر کی تعمیر غیر ملکی سامان اور ہنر مندوں کی مدد سے کی گئی اور شام، ایران، موصل، کوفہ، بصرہ اور واسط سے کاریگر منگوائے گئے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے تہذیبی وثقافتی فنون کے دوبڑے سرچشمے ہیں، ایک مشرقی مسیحی اور دوسرا ساسانی۔ قدیم ترین

---

(1) A.R.Nicholson, *ALitrary History of The Arabs* (Cambridge:Cambridge University Press,1956), p 28.

(۲) شبلی نعمانی، المامون، ص: ۱۳۹

(۳) الطاف حسین حالی، مسدس، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور وکراچی، س ن، ص: ۳۰

اسلامی آثار و عمارات مثلاً بیت المقدس کی کاشی کاری، دمشق، کاسنگی روکار اور عمرہ کے صحرائی محل کی تصاویر میں آرائش کے کئی ایک خاص انداز پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں جو مشرق کے مسیحی آرٹ اور ساسانی آرٹ سے ماخوذ ہیں۔ مصر، شام اور عراق کے مسیحی آرٹ میں آرائش کی چند ایک ایسی نمایاں خصوصیات پائی جاتی ہیں جو عہد اسلام کے دور اول کی عمارات میں بھی موجود ہیں۔ ساسانی عہد کے شہروں مثلاً مدائن اور دامغان (ایران) میں جو کھدائیاں ہوئی ہیں وہاں سے ملنے والے آثار میں بہت سے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جن کی قدیم اسلامی زمانے میں نقل کی گئی تھی۔[۱]

عہدِ بنی عباس میں مختلف تہذیبوں کے انضمام وادغام کے نتیجے میں جو اثرات اسلامی تہذیب وتمدن پر وارد ہوئے انہیں درج ذیل نکات کی صورت میں واضح کیا جاسکتا ہے۔

۱.۳-ایرانی تہذیب کے عناصر کا اسلامی تہذیب وتمدن پر اثر

خلافتِ عباسیہ کے قیام میں اہلِ ایران کا بڑا اہم کردار تھا۔ ایرانیوں نے اموی اقتدار کے خلاف فیصلہ کن اقدامات میں صفِ اول کے جنگجوؤں کا کردار ادا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عباسیوں کے غلبے کے بعد حکومتی ایوانوں میں ایرانی اثرات واضح طور پر محسوس ہونے لگے۔ یہ اثرات نظمِ مملکت، علم وفن اور روزمرہ معمولات سمیت زندگی کے ہر پہلو پر مرتب ہو رہے تھے۔[۲] ایرانیوں کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا اور انھوں نے عربی زبان سیکھ لی۔ عربی اور فارسی، دونوں زبانوں نے ضرب الامثال اور کہانیوں میں اخذ وعطا کے مراحل کو طے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اموی عہد میں بہت سے ایسے عربی گو شعرا کے تذکرے ملتے ہیں جن کا تعلق ایران سے تھا۔ ان میں زیاد العجم، ابنِ یسار نسائی، اسماعیل بن یسار محمد، ابراہیم، ابوالعباس اعمیٰ اور موسیٰ شہوات کو بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ اس لسانی وادبی اختلاط کے اثرات عربوں کو مجالس، گفتگو اور رسم الخط پر بھی واضح طور پر محسوس ہونے لگے۔[۳]

عباسی خلافت میں عرب و ایران کی ثقافتوں کے انضمام کی تفہیم کے لیے ذہین شاعر ابونواس (۷۵۷ء-۸۱۴ء) کی سوانح حیات کا مطالعہ بڑا اہم ہے، اس کا والد ایک عرب جب کہ والدہ ایرانی تھی، وہ عربی شاعری پر مکمل عبور رکھتا تھا، تاہم فارسی تمدن نے اس کی زندگی پر بہت اثرات مرتب کئے تھے۔ وہ بالوں میں لمبی چوٹی باندھتا، جشنِ

---

(۱) ایم۔ ایس۔ ڈیمنڈ، مسلمانوں کے فنون، مترجم: پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، لاہور، پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۶۴ء، ص: ۳۱-۲۱

(۲) احمد امین مصری، ضحی الاسلام، ص: ۳۲-۳۰

(۳) احمد امین مصری، فجر الاسلام، مترجم: عمر احمد عثمانی، ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵-بی گلبرگ، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص:۳۷۹-۳۰۹

نوروز مناتا اور اپنے کلام میں فارسی کی آمیزش کرتا تھا۔ عباسیوں کے آنے سے ایرانی زبان، تہذیب اور اقدار کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ یاد رہے کہ عباسی کمانڈر ابو مسلم خود نسلی طور پر ایک خراسانی اور ایرانی تھا۔[۱] عباسیوں نے یہودیوں، عیسائیوں اور ایرانی مسلمانوں کو حکومت میں اہم عہدے دیے۔ اس سے تکثیریت کا ایک اچھا معیار قائم ہو گیا۔

عباسی خلافت میں ایرانی آداب کو بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، خلفا نے اس ضمن میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا، منصور پہلا خلیفہ تھا جس نے اپنے دربار میں ساسانی بادشاہوں کے ایرانی آدابِ شاہی، ان کی شان وشوکت اور زیب وآرائش کے طریقوں کو اختیار کیا تھا۔ اس نے ایرانی سلاطین کے نظام کے مطابق ارکانِ سلطنت، سرکاری ملازمین اور افسروں کو ان کے درجات اور مراتب کے مطابق دربار میں نشستیں عطا کیں اور بیٹھنے کے آداب مقرر کیے نیز گفتگو اور سوال وجواب میں ایرانی آداب کی تقلید کی۔[۲] عباسی خلافت کے قیام سے فارسی زبان کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہو گئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ حاکم قوم کی زبان عربی تھی اور عوام میں بھی حاکموں کی اس زبان کو فوقیت حاصل تھی۔ لیکن بغداد اور دوسرے شہروں میں ایرانی خاندان آباد تھے، یہ لوگ فارسی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ اس کی ایک اہم مثال خاندانِ برامکہ ہے، علاوہ ازیں خلفا کے بہت سے درباری، تجّار اور علما بھی آپس میں فارسی بولتے تھے۔[۳]

معمولاتِ حیات میں بھی ایرانی عنصر غلبہ پا رہا تھا، مثلاً اکاسرۂ ایران کا یہ دستور تھا کہ موسمِ گرما میں ان کے کمرے کا فرش روزانہ نئی مٹی سے لیپا جاتا۔ اسی میں وہ دوپہر کے وقت آرام کرتے۔ اس کے علاوہ کمرے کے چاروں طرف بانس اور گھاس کی موٹی موٹی ٹٹیاں بنا کر نصب کر دی جاتیں اور ان کے بندھنوں میں قدرتی برف کے ٹکڑے رکھ دیے جاتے۔ منصور پہلا شخص تھا جس نے موسمِ گرما میں خس کا استعمال شروع کیا۔ وہ ابتدائی عہد میں روزانہ اپنے کمرے کو لپوایا کرتا تھا اور اسی میں دوپہر گزارا کرتا تھا۔ اس کے بعد دوسرے خلفا نے خس کی ٹٹیاں بنوا کر استعمال

---

(۱) طارق فتح، اسلامی ریاست کا خواب، ص: ۲۶۷

(۲) ڈاکٹر عبد الجبار الجومرد، خلیفہ ابو جعفر منصور، ص: ۳۵۵

(۳) ڈاکٹر عبد الجبار الجومرد، ہارون الرشید، ص:۲۹۵

کیں اور اس کو دیکھ کر پھر سب لوگوں نے ان کا استعمال شروع کر دیا۔ اسی طرح گرمی کے خاتمے کے لیے ایران میں دوہری چھت کا رواج تھا۔ ہارون پہلا شخص ہے جس نے اس رواج کو اختیار کیا۔[۱]

عباسی عہد میں فروغ پانے والی گچ کاری بھی ایرانی تہذیب کے اثر کا ایک اہم مظہر تھی۔[۲] اس دور میں گچ کاری اور استر کاری پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے اور اینٹوں سے چنائی کی جاتی۔ یہ طرز ساسانی عہد کی یادگار تھا اور نقش و نگار میں بھی اسی دور کے تصورات کا اعادہ کیا جاتا تھا۔ سامرا میں تمام رہائشی کمروں میں کاشی کاری کی گئی تھی اور بڑے خوب صورت حاشیے بنائے گئے تھے، دیواروں پر مختلف شکلوں کے مندوے نکالے گئے تھے۔ کہیں کہیں رنگین تصویریں بھی تھیں۔ بغداد کا طرزِ آرائش بھی غالباً ایسا ہی تھا۔ آرائش میں بیلوں اور انگور کے خوشوں کی بہتات تھی۔ شِتّوں کے آرائشی طرز بھی ایسے ہی ہوتے جن میں سایہ اور نور کے میل سے دھندلے اور پس منظر پر تصویریں نمایاں کی گئی تھیں۔ عباسی دور میں بھی بیل بوٹوں اور پھول پتیوں سے آرائش کا کام لیا گیا۔ آرائش کا یہ اربی اور سلامی دار طرز سامرا سے شروع ہوا جس سے عباسی دور کا ایک خاص طرز وجود میں آگیا۔ کوئی شبہ نہیں کہ سیتھین قوم کی جانوروں کی تصویریں، جو تورانی فن میں نمایاں تھیں، عباسی طرزِ آرائش میں شامل ہو گئیں۔ یہ تصویریں تانبے کی تختیوں اور چوبی چوکھٹوں پر کندہ کی جاتی تھیں اور تاجروں کے ذریعہ بغداد اور سامرا پہنچتی تھیں۔ آرائش میں انہی کی نقل کی گئی۔ ترکی فوجیوں نے غالباً اپنے وطن کی یہ چیز سامرا میں داخل کی تھی اور خلیفہ نے ترکی فوجی عہدہ داروں کو خوش کرنے کے لیے اس کو محل کی آرائش میں شریک کر لیا تھا۔ وجہ کوئی بھی ہو یہ امر مسلمہ ہے کہ اربی اور سلامی دار کندہ کاری خالص سیتھین طرز کی ہے جس میں تصورات بالکل محدود ہیں لیکن تنوّع موجود ہے۔ پھر یہی نقش و نگار پارچوں پر بھی منتقل کیے گئے جو ریشمی کپڑے کے ہوتے اور دیواروں پر گوٹ اور حاشیہ کے طور پر لگائے جاتے تھے۔ دروازوں پر بھی ایسے ہی نقش کھودے گئے اور دروازوں کے چوکھٹے بھی انہی سے آراستہ کئے گئے۔ یہ تصویریں نہ صرف استر کاری پر اتاری جاتی تھیں بلکہ ان کے سانچے تیار کر لیے گئے تھے جن کو دبا کر گچ پر تصویریں اُبھار دی جاتی تھیں۔ سامرا میں یہ کام ہر جگہ لکڑی پر کیا جاتا اور کہیں کہیں سنگِ مرمر پر بھی۔ پھر دروازوں کے دلوں پر اس کا استعمال عام ہو گیا اور یہ صنعت پورے عراق میں پھیل گئی۔[۳]

---

(۱) الطبری، ابو جعفر محمد ابن جریر، تاریخ الامم والملوک، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۶م، ج:۶، ص: ۳۲۵

(۲) ایم۔ ایس۔ ڈیمنڈ، مسلمانوں کے فنون، ص: ۱۳۲-۱۲۷

(۳) ارنسٹ کوہنل، اسلامی آرٹ اور فنِ تعمیر، مترجم: مولانا غلام طیب، فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور، ص: ۵۰-۴۹

عباسی خلفا، امرا، وزرا اور صاحب ثروت لوگوں نے عظیم محلات تعمیر کیے۔ ابو جعفر منصور نے بغداد کے وسط میں" قصر الذہب" کے نام سے اپنا محل بنوایا۔ محل کے آغاز میں ہی ایک ایوانِ خاص بنوایا جس کی لمبائی تیس گز اور چوڑائی بیس گز تھی۔ اس میں ایک بلند گنبد تھا، اُس میں مجلس ہُوا کرتی تھی۔ اس گنبد کے اوپر ایک اور سبز رنگ کا گنبد تھا، محل کی اونچائی اسّی گز تھی۔ محل کو پکی اینٹوں اور چونے کی مدد سے بنایا گیا تھا۔ کمروں میں ساج کی لکڑی کے ستون لگائے جاتے تھے اور چھت بھی لکڑی کی بنائی جاتی تھی۔ گنبد کی چوٹی پر ایران کی بنی ہوئی تصویریں تھیں جن کے ہاتھوں میں نیزے تھے۔ یہ تصویریں ہوا کے رخ پر گھوما کرتی تھیں۔[۱] ان تفصیلات سے قطع نظر عباسی عہد میں عالمِ اسلامی کے مختلف علاقوں میں ایرانی طرزِ تعمیر کو ترویج حاصل ہوئی۔ فلپ کے ہٹی نے بھی عباسی عہد کی تعمیرات پر ایرانی اثرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔[۲]

وہ کاریگر جن سے عربوں نے شام میں کام لیا زیادہ تر ایرانی تھے یا مشرقی۔ عربوں کی نسبت ان معماروں کے ساتھ ویسی ہی تھی جیسے کسی نئے امیر کی ہوتی ہے جو اپنی نئی دولت کو عمارت کے بنانے میں صَرف کرتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں بنانے والا جیسا بھی ہو عمارت کی وضع میں ہمیشہ مالک کے ذاتی خیالات شامل رہتے ہیں۔ ان ایرانی اور مشرقی معماروں کے لیے بھی لازم تھا کہ تعمیر کی وضع میں عربوں کے خیالات کی پابندی رکھتے اور یہی وجہ ہوئی کہ تھوڑے ہی زمانے کے بعد عربوں کی عمارات نے ایک ایسی خاص وضع پیدا کر لی اور ان کی اندرونی آرائش اور گلکاریاں کچھ ایسی خاص وضع پر ترتیب دی گئیں کہ ان میں اور دوسری عمارات میں ایک بیّن فرق معلوم ہونے لگا۔ یہ ممکن ہے کہ اختلافِ ملک کے لحاظ سے آرائشوں اور گلکاریوں کی ترکیب کہیں ایرانی اور کہیں مشرقی اور کہیں ہندی ہو لیکن عمارت کی مجموعی وضع اور اس کے مختلف حصوں کا تناسب بالکل عربی ہے۔[۳]

عباسی عہد میں جلد سازی کی صنعت پر بھی ایرانی اثرات واضح تھے۔ اس عہد میں کتابوں کی خوب صورت جلد کے لیے چمڑا استعمال کیا جاتا تھا۔ چمڑے کے اوپر سونے سے بنی روشنائی سے لکھا جاتا تھا۔ عباسیوں نے یہ طریقہ

---

(۱) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۱ء، ج:۱، ص:۷۳؛ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، تاریخ الاسلام، ج:۲، ص:۳۵۸-۳۵۶۔

(2) Philip K.Hitti, *History of The Arabs*, pp. 416-419.

(۳) گستاؤلی بان، تمدنِ عرب، ص:۲۷۲

اہلِ ایران سے سیکھا تھا۔[1] جلدوں پر ہندسی نقش و نگار کیے جاتے تھے اور دباؤ کے ذریعے سنہرے نقطے ڈالے جاتے تھے۔ خطاطی کے میدان میں بھی ایرانیوں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ عربوں کی آمد سے پہلے ایران میں پہلوی خط رائج تھا مگر فتوحاتِ اسلامی کے بعد ایرانیوں نے اس خط کو چھوڑ دیا اور قبولِ اسلام کے ساتھ ساتھ اپنی قومی زبان کے لیے عربی رسم الخط اختیار کر لیا۔ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت اور شائستہ ذوق کی بدولت اس میں جدّتیں پیدا کیں اور اس کو ایسا آراستہ و پیراستہ کیا کہ اسے ایک فنِ لطیف کے درجے پر پہنچا دیا۔ علاوہ ازیں اہلِ ایران نے کتابوں کی زیب و زینت کے طریقے بھی عربوں سے سیکھے، مگر ایرانی خطاطوں نے عباسی عہد کے خطِ کوفی کی ایک ایسی صورت اختیار کی جس کے حروف کے عمودی حصوں پر اُفقی حصوں کی نسبت زیادہ زور دیا گیا۔ دسویں صدی عیسوی کے ایک چھوٹی تقطیع کے چرمی قرآن پاک کے چند اوراق مختلف مجموعوں میں محفوظ ہیں جو ورق نیویارک کے میٹرو پالیٹن میوزیم میں موجود ہے، اس میں سورت کے عنوان کی گلکاری دور عباسی کے مصحفوں کے نقش و نگار کے مشابہ ہے۔[2]

خطِ کوفی پانچ سو سال تک کتبات اور قرآن نویسی کے لیے مستعمل رہا۔ قرآن کا قدیم ترین نسخہ جو آٹھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی تاریخ وقف ۱۶۸ھ بمطابق ۷۸۴ء ہے قاہرہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ عباسی دور کے اکثر مصحف نویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں جو جھلی پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان جھلیوں کا رنگ یا تو فطری اور قدرتی ہے یا آسمانی، بنفشی یا قرمزی ہے اور وہ سیاہی یا طلائی روشنائی سے خطِ کوفی میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے حروف موٹے اور گول شکل کے ہیں، عمودی خطوط چھوٹے اور اُفقی خطوط لمبے ہیں۔ اس قسم کا کوفی خط مصر، شام اور عراق میں نویں اور دسویں صدی عیسوی کے کچھ حصے میں رائج رہا۔ نیویارک کے میٹرو پالیٹن میوزیم میں عباسی عہد کے ایک چھوٹی تقطیع والے کلام پاک کا کچھ حصہ اور بڑی تقطیع کے قرآن پاک کے چند متفرق اوراق موجود ہیں۔ پہلا نسخہ سورۃ البقرۃ کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہے۔ اس کے چار زریں اوراق خاص طور پر قابلِ دید ہیں، ان پر پیچیدہ نقوش، پھول پتے اور پودے بنے ہوئے ہیں۔ ان نقوش کا خاکہ بادامی روشنائی میں ہے مگر اس کے اندر سونے کا پانی پھیرا گیا ہے، اور کہیں کہیں سُرخ، سبز، آسمانی اور زرد رنگوں کی آمیزش ہے۔ بسا اوقات یہ رنگ آمیزی کتاب کے متن تک پہنچ گئی ہے۔ سُورت کے مزین عنوان کی ترتیب بالعموم یوں ہوتی ہے کہ سورت کا نام ایک مستطیل چوکھٹے کے اندر مرقوم ہوتا ہے اور اس چوکھٹے سے ایک درخت نمودار ہوتا ہے۔ نویں صدی عیسوی کے دیگر قرآنی نسخوں

---

(1) R.Levy, “Persia and The Arabs”, in A.J.Arberry (ed.), *The Legacy of Persia* (London: Oxford University Press, 1963), p 77.

۲۔ ایم۔ ایس۔ ڈیمنڈ، مسلمانوں کے فنون، ص: ۱۰۴-۹۹

کی آرائش اور عنوان سُورت کے یہ نقش و نگار عباسی اُسلوب کے ساتھ مخصوص ہیں جن میں ساسانی آرٹ کی بہت سی خصوصیات موجود ہیں، مثلاً چوکھٹے کی ایک جانب سے چھوٹے چھوٹے درخت پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔[۱]

عباسی خلفا کے ہاں ایرانی لباس بھی بہت پسند کیا جاتا تھا۔ خصوصاً ہادی، ہارون اور مامون اکثر ایرانی لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔ منصور ایرانی طرز کا جبہ پہنا کرتا تھا۔ لباس کی تزئین وآرائش اور عوام میں اپنا امتیاز برقرار رکھنے کے لیے خلفا سونے کی کڑھائی بھی کروایا کرتے تھے۔ خصوصاً خلیفہ متوکل ایسا کیا کرتا تھا۔ خلیفہ کے بعد متمول لوگوں کا طبقہ تھا۔ ان کا لباس قمیض، پاجامہ، ٹوپی اور شیروانی ہوتا تھا۔ عوام کا لباس ازار، قمیض اور لمبے جبے پر مشتمل ہوتا تھا۔[۲] قاضی اور عمال سیاہ لباس پہنا کرتے تھے۔[۳] قاضی پگڑی اور سبز چادر یعنی طیلسان بھی پہنا کرتے تھے۔[۴] عورتوں کے لباس پر بھی ایرانی تہذیب کے اثرات نمایاں تھے،وہ خوب صورت نظر آنے کے لیے ایک قسم کی قبہ نما ٹوپی پہنا کرتی تھیں۔ اس کے نچلے سرے کے اطراف ایک پٹی لگی ہوتی تھی اور اس پٹی کو جواہرات سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ نسوانی حسن و جمال کی آرائش کے لوازمات میں پازیب اور کنگن بھی استعمال ہوتے تھے۔ مردوں کے لباس کی وضع قطع بدلتی رہی۔ عام طور پر مرد نمدے یا اون کی نیلی سیاہ ٹوپی پہنا کرتے تھے، ان کی پوشاک ایرانی اصل کے پاجامے، قمیض، عبا، صدری اور جبہ پر مشتمل ہوتی تھی۔[۵] لباس کے علاوہ غذاؤں اور کھانوں میں بھی ایران کے اثرات نمایاں تھے۔ ایران کے دم پخت کھانے، نفیس حلوے اور مٹھائیاں اہلِ بغداد کی توجہ کا مرکز تھیں۔[۶]

۲.۳-فرانسیسی تہذیب کے اسلامی تہذیب کے ساتھ روابط

عباسی خلافت کے بین الاقوامی روابط اہلِ فرانس سے بھی قائم ہو چکے تھے۔ہارون الرشید کے دور میں مسلمانوں کا تمدن عُروج پر تھا۔ شہنشاہ فرانس شارل مین جو حقیقت میں تمام یورپ کا مالک تھا،نے ہارون الرشید کے پاس سفیر بھیجے اور نہایت ادب سے خواہش کی کہ زائرین بیت المقدس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ خلیفہ نے اس

---

(۱) مصدر نفسہ، ص:۱۰۱-۹۹

(۲) ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، تاریخ اسلام، ج: ۲ ،ص:۴۲۸-۴۲؛ ڈاکٹر عبدالجبار الجومرد، خلیفہ ابوجعفر منصور، ص: ۶۲۷

(۳) پروفیسر آدم متز، الحضارۃ الاسلامیہ فی القرن الرابع الھجری، دارالکتب العربی، بیروت،۱۹۹۸ء ج:۱، ص:۴۱۷

(۴) ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، تاریخ اسلام، ج:۲، ص:۴۲۷

(5) Philip K.Hitti, *History of The Arabs*, p334

(6) Ibid, p 335.

درخواست کو قبول کیا اور سفیروں کو بیش بہا تحائف دے کر رخصت کیا۔ ان تحائف میں ایک ہاتھی بھی تھا جس کی جھول بہت ہی قیمتی تھی اور یہ جانور اس سے پہلے کبھی یورپ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے علاوہ موتی، جواہرات، ہاتھی دانت، لوبان اور ریشمی انواع واقسام کے کپڑے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ وقت بتانے والی ایک گھڑی تھی جو گھنٹوں پر بجتی تھی۔ اس گھڑی کی وجہ سے شارل مین اور اس کے نیم وحشی مصاحبین چکرا کر رہ گئے۔ اس کے دربار میں کوئی شخص بھی اس لائق نہ تھا جو اس گھڑی کے کیل کانٹوں کو سمجھ سکتا۔[۱]

عباسیوں اور فرانسیسیوں کے تہذیبی روابط کے نشانات فنونِ لطیفہ خصوصاً خطاطی اور مصوری کے میدان میں بھی نظر آتے ہیں۔ پیرس کے سرکاری کتب خانے میں تیرہویں صدی عیسوی کی ایک تصویر ہے جس کے چاروں طرف ایک حاشیہ ہے۔ اس حاشیے کی صورتوں کے ملانے سے عربی حروف میں ایک حکایت پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح عباسیوں کا بہت مشہور تصویروں والا پیالہ وہ ہے جو سینٹ لوئی کے کاسۂ اصطباغ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کاسہ سے فرانس کے ہزاروں بچوں نے اصطباغ پایا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ سینٹ لوئی اسے صلیبی جنگ کے زمانے میں لایا تھا۔ یہ تیرہویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ اس پر سوسن کے پھول بنے ہوئے ہیں۔[۲]

۳.۳-ترک تہذیب سے استفادہ

عباسی خلافت کے استحکام میں ترک قوم کو ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کے اس عہدِ زریں میں ترکوں کو دیگر اقوام خصوصاً عربوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ معتصم وہ پہلا خلیفہ تھا جس نے ترکوں کو سرکاری دفاتر میں ملازم رکھا، یہ ترک ملازمین شاہی لباس پہنتے تھے اور سونے کی پیٹیاں باندھے بازاروں میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے۔[۳] معتصم نے ترک سپاہیوں کے لیے الگ شہر "سامرا" آباد کیا،[۴] اُن کو مخصوص جاگیریں دیں،[۵] وہ خود ترکی وضع اختیار کرتا تھا، ترکی زبان میں گفتگو کرتا تھا اور لوگوں کو بھی ترکی زبان

---

(۱) گستاؤلی بان، تمدنِ عرب، ص: ۲۹۲؛ ڈاکٹر عبدالجبار الجومرد، ہارون الرشید، ص: ۶۰۹-۶۰۵

(۲) گستاؤلی بان، تمدنِ عرب، ص: ۶۵۱-۶۵۰

(۳) السیوطی، تاریخ الخلفاء، ص: ۳۳۵؛ موسیو سیدیو فرانسیسی، تاریخ عرب، ص:۲۴۵؛ جرجی زیدان، تاریخ تمدنِ اسلام، مترجم: حلیم انصاری ردولوی، سٹی بک پوائنٹ، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۴ء، ۱۰۷؛ ایم۔ ایس۔ ڈیمنڈ، مسلمانوں کے فنون، ص: ۱۶؛ عباد اللہ اختر، بغداد، تخلیقات، ۳-مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۳۰۹-۳۰۸

(۴) یاقوت الحموی، معجم البلدان، طبعۃ السعادۃ بجوار، مصر، ۱۹۰۶م، ج:۱۴، ص:۵

(۵) المسعودی، مروج الذہب ومعادن الجواہر، ج:۴، ص:۵۰

بولنے پر مجبور کرتا تھا۔[۱] ان اقدامات سے مسلم دُنیا میں ترکوں کی سیاسی حیثیت بہت بڑھ گئی، یاد رہے کہ واثق وہ پہلا خلیفہ تھا جس نے ۲۲۸ھ میں کسی ترک رہ نما یعنی اشناس ترکی کو وزیر اعظم بنایا۔[۲]

۴.۳-قدیم یونانی اور سُریانی تہذیب سے علمی اور ثقافتی روابط

فتوحاتِ اسلامی کے عہد میں مسیحیت مختلف فرقوں میں تقسیم تھی، مسیحی پادری باہمی مناظروں میں یونانی فلسفہ کا استعمال کرتے تھے اور عقلی دلائل سے کامیابی حاصل کرتے تھے۔ پادریوں کا یہ اُسلوب مذہب اور فلسفہ کے امتزاج کا باعث بنا۔ اسلام کی آمد اور اس کی وُسعت نے مسیحی پادریوں کو مسلم عُلما کے سامنے لا کھڑا کیا۔ انھوں نے علم واعتقاد کے میدان میں مسلمانوں کے خلاف بھی یونانی منطق وفلسفہ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ اس روش نے مسلمانوں میں موجود فلاسفہ، متکلمین، معتزلہ اور صوفیا پر گہرے اثرات مرتب کیے، اب مسلمانوں کے لیے بہت ضروری ہو گیا کہ وہ یونانی علم وحکمت کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں اور اس کے منفی اثرات سے محفوظ رہیں۔ اس میں انھوں نے بھرپور کامیابی حاصل کی اور یونانی علوم وفنون کی تحقیق وتنقید میں شاندار خدمات سر انجام دیں۔ یونانی کتب کا زیادہ تر ذخیرہ سُریانی زبان میں ترجمہ شدہ حالت میں دست یاب ہوا۔ یاد رہے کہ یونانی فلسفہ کو فروغ دینے میں اہلِ عراق خصوصاً سُریانیوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان لوگوں نے یونانی کتب کا سُریانی زبان میں ترجمہ کیا۔ یوں سُریانی مسیحی علم وادب کی نمائندہ زبان قرار پائی۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل عراق وایران میں سُریانی اور یونانی دونوں زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے لیے باقاعدہ مسیحیوں کے دینی ادارے قائم تھے۔ سُریانی زبان بت پرستی اور اس کے آداب کی زبان بھی تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے عربی زبان نے سُریانی زبان کی جگہ لے لی۔ کیوں کہ بہت سے سُریانی مسلمان ہو گئے تھے اور مسلم اقتدار کا ایک باوقار حصہ قرار پا گئے تھے۔ جب عباسی عہد میں فلسفہ اور دیگر علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا دور آیا تو سُریانی علما نے ترجمے کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں۔[۳] عباسیوں نے جن یونانی کُتب کے تراجم کرائے ان میں موسیقی سے متعلق کُتب بھی تھیں، ایسے بہت سے شواہد ملے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عباسی عہد میں مسلمانوں نے موسیقی سے متعلق بہت سے ابتدائی تصورات

---

(۱) وِل ڈیورانٹ، اسلامی تہذیب کی داستان، مترجم: یاسر جواد، نگارشات، مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۷۶؛ عباد اللہ اختر، بغداد، ص: ۳۰۹-۳۰۸

(۲) ابن اثیر، علی ابن محمد، الکامل فی التاریخ، دار الکتب العربی، بیروت، ۱۹۶۷ء، ج: ۵، ص: ۲۶۹؛ السیوطی، تاریخ الخلفاء، ص: ۳۴۰

(۳) احمد امین مصری، فجر الاسلام، ص: ۴۱۷-۳۸۰

اور فنی اصطلاحات کو ان یونانی کتب سے ہی حاصل کیا تھا۔[1] اس علمی وثقافتی اتصال سے جو منفرد تہذیب تشکیل پائی اس کی خوب صورتی اور دلکشی کا سہرا عباسی عہد کے خلفا، علما اور اُدبا کے سر ہے۔

۵.۳-رومی تہذیب سے استفادہ

ظہورِ اسلام کے وقت رومی سلطنت نہایت مستحکم تھی لیکن عباسی عہد میں مسلمانوں کی علمی وسیاسی حیثیت اس سے کہیں بہتر ہوچکی تھی۔ عباسیوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد بین الاقوامی روابط اور تہذیبی اخذواستفادہ پر خصوصی توجہ دی نیز علم وفکر اور فلسفہ وحکمت کے میدان میں بہت سی چیزیں سیکھیں۔ ہارون بڑی فراخ دلی کے ساتھ رومی کتب کا ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اپنے جہاد اور فتوحات کے سلسلے میں جو یونانی اور بازنطینی کتابیں وہ ساتھ لایا ہے ان سب کا ترجمہ کیا جائے۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس نے بہت زیادہ دولت صَرف کی اور انعام واکرام کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کردیا۔ اس کا یہ ذوق وشوق اور التفاتِ خاص دیکھ کر مملکت کے وزرا اور اُمرا کس طرح خاموش بیٹھ سکتے تھے، انھوں نے بھی اپنے خلیفہ کی پیروی کی اور غیر زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کے سلسلے میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا شروع کردیا۔[۲] اسی روش کو مامون نے بھی جاری رکھا۔ اس نے ملک روم سے کتاب اقلیدس منگوائی اور اس کے ترجمے وتشریح کا حکم دیا۔[۳]

عباسیوں نے اہلِ روم کی طرز پر ایک دلچسپ سیاسی تجربہ بھی کیا اور خاتون کی حکومت قائم کردی۔ ۳۰۶ھ میں مقتدر کی والدہ شغب نے حکومت کے تمام کاموں کی نگرانی کی، یہاں تک کہ وہ فوج داری مقدمات کا فیصلہ بھی خود کرتی تھی۔ ہر جمعہ کو دربارِ عام کرتی تھی جس میں قضاۃ اور اراکینِ حکومت حاضر رہتے اور وہ اپنے دستخطی فرامین جاری کرتی تھی۔[۴]

اہلِ روم کی بنائی ہوئی اشیا بھی عباسی خلفا اور عوام میں بڑی مقبول ہوتی تھیں۔ مقتدی کے دورِ خلافت کا مشہور واقعہ ہے کہ سلطان ملک شاہ کی بیٹی کا سامان ایک سو تیس اونٹوں پر آیا، اس سامان کا ایک اہم اور قابلِ ذکر جزو

(1) Philip K.Hitti, *History of The Arabs*, pp. 427-428.

(۲) عبدالجبار الجومرد، ہارون الرشید، ص:۵۱۹

(۳) ابو حنیفہ الدینوری، الاخبار الطوال، مترجم: پروفیسر محمد منور، مجلس ترقیٔ ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۶۴۸؛ وِل ڈیورانٹ، اسلامی تہذیب کی داستان، ص: ۷۵؛ گستاؤلی بان، تمدنِ عرب، ص:۵۹۲؛ رابرٹ بریفالٹ، تشکیلِ انسانیت، ص:۲۶۰-۲۵۷۔

(۴) السیوطی، تاریخ الخلفاء، ص: ۳۸۱

وہ عُروسی لباس تھا جو روم سے بن کر آیا تھا۔(۱) علاوہ ازیں بہت سے مکانات ایسے تھے جو عباسی خلفا نے اہلِ روم کی طرز پر پکی اینٹوں سے تعمیر کر رکھے تھے اور ان پر تزئین و آرائش کے لیے رنگ کیا جاتا تھا۔ ان کے مکانات تین حصوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ پہلا حصہ خود اپنے اور اپنے حرم کے لیے، دوسرا حصہ خدّام کے لیے اور تیسرا مہمانوں کے لیے۔ باغات اور پھولوں والے پودے رہائش گاہوں کی زینت میں اضافہ کرتے تھے۔ دیواروں اور چھتوں پر سنہری رنگ سے لکھائی کی جاتی تھی۔ چھتوں پر بلند گنبد بنائے جاتے تھے جو دُور دُور سے نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گنبد کے اندر معلق ہیں۔ خُلفاو اُمرا کے گھروں کے ارد گرد ایک فصیل ہوتی تھی جبکہ عوام الناس کے ہاں ایسا نہیں تھا۔ علاوہ ازیں خواص کے گھروں میں کھڑکیاں اور روشن دان ہوتے تھے جن کے ذریعے باہر دیکھا جاسکتا تھا۔(۲)

عباسیوں کی مصوری کے بہت سے نمونوں پر بھی رومی تہذیب کے اثرات نمایاں تھے۔ متوکل نے اپنے محل کی دیواروں پر نقش و نگار کرنے کے لیے بازنطینی نقاش مقرر کیے تھے۔ کلیسا اور راہبوں کی تصویریں اتارنے میں انھیں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی۔(۳) دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ پچی کاری کا فن بھی مسلمانوں نے اہلِ روم سے سیکھا اور اس میں خوب ترقی کی۔ دو قسم کی پچکاری کو رواج دیا گیا۔ ایک تو وہ جو فرش اور دیواروں کے لیے مستعمل تھی اور سنگِ مرمر کے ٹکڑوں اور چھوٹی بڑی مختلف رنگوں کی میناکار اینٹوں سے بنتی تھی اور دوسری وہ جو دیواروں پر خصوصاً محراب کی دیواروں پر جمائی جاتی تھی۔(۴)

۶.۳-ہندی تہذیب سے استفادہ

عہدِ بنی عباس میں پروان چڑھنے والی مختلف اقوام کی مخلوط و مشترک تہذیب میں ہندوستانی مذاہب، زبانوں، سماجی روایات اور فنونِ لطیفہ کا بھی قابلِ قدر حصہ شامل تھا۔(۵) یہی وجہ ہے کہ عباسی خلافت کے قیام کے بعد ہندوستان کی سیاسی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا، یہ عباسی خلافت کی شان و عظمت کی عطائے خاص ہے کہ اس نے ہندوستان کی علاقائیت ختم کر کے اسے عالمی شاہراہ پر کھڑا کیا، اس سے ہندوستان کے علمی، فکری، تمدنی، تہذیبی، تجارتی، معاشی اور معاشرتی اُمور میں وُسعت آگئی، یہاں کے لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا اور یہاں کے عُلوم وفنون کو پوری دُنیا کے

---

(۱) ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنھایۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۳ء، ج:۶، ص: ۱۶۲

(۲) ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، تاریخ الاسلام، ج:۲، ص:۴۲

(3) Philip K.Hitti, *History of The Arabs*, p 424.

(۴) گستاؤلی بان، تمدنِ عرب، ص:۶۵۷

(۵) احمد امین مصری، ضحی الاسلام، ص: ۳۲-۱۸

سامنے استفادہ کے لیے پیش کر دیا گیا۔[۱]

اہلِ بغداد اور اہلِ ہند کے سیاسی، سماجی، تجارتی، علمی اور ادبی رشتے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ عباسیوں کے برمکی وزرا نے اس ضمن میں خصوصی کردار ادا کیا۔ منصور کے عہد میں ایک ہندوستانی منجم کی بغداد آمد کتبِ تاریخ میں بڑی کثرت سے بیان ہوئی ہے۔ اس نے علمِ نجوم پر ہندوستانی کتاب" سدھانت "کا تعارف کرایا، ابراہیم انفرازی اور یعقوب بن طارق نے اس سے نجوم اور ریاضیات کے علوم سیکھے۔ یہ تینوں استاد شاگرد مل کر کام کرنے لگے، انھوں نے ہندوستانی منجم برھمہ گپتا کی دو معروف کتابوں یعنی "براہمہ سدھانتا" اور" کھنڈ کھادیکہ "کے عربی میں تراجم کیے۔[۲] ہندی کہانیوں پر مشتمل بیدپا کی تصنیف "کلیلہ ودمنہ" کا عربی ترجمہ ابن المقفع نے کیا۔ علم وثقافت کی مظہر اس کتاب میں حیوانی مناظر، درختوں اور پودوں کی اشکال بڑی خوب صورت ہیں۔ علاوہ ازیں دیار بکر کے رہائشی ایک معروف سائنس دان ارتقی سلطان نورالدین محمد کی ایجادات پر مشتمل ایک کتاب بدیع الزمان الجذری نے لکھی۔ اس کتاب میں آبی گھڑیوں اور کئی دوسرے خود کار آلات کا تذکرہ تھا۔ اس کتاب کا نام **فی معرفة الحیل الهندسیة** ہے۔[۳] بیت الحکمت میں خدمات سرانجام دینے والوں میں ہندوستان کے مترجمین بھی شامل تھے، وہ ہندی اور عربی زبانوں کے ماہر تھے اور یہاں کی علمی وفنی کتب کا ترجمہ کرتے تھے۔ مثلاً ابن دہن ہندی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ برامکہ کے شفاخانے کے اُمور کا ناظم بھی تھا۔ منکتہ الہندی ان مترجمین میں شامل تھا جو اسحاق بن سلیمان بن علی ہاشمی کی ماتحتی میں بیت الحکمت میں کام کرتے تھے۔[۴] ان خدمات کا ہی اثر تھا کہ ہندوستانی مترجمین کی تعریف وتوصیف بہت سے مؤرخین نے کی ہے خصوصاً بصرہ کے معروف انشاپرداز، فلاسفر،

---

(۱) قاضی اطہر مبارکپوری، خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان، اسلامک پبلیکیشنز ہاؤس، ۲- شیش محل روڈ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۳۵-۳۶؛ سید سلیمان ندوی، عرب وہند کے تعلقات، ص: ۱۳۲-۱۲۴

(۲) شریف حسین قاسمی، ہندوستانی کتابوں کے فارسی تراجم-ہندوستانی مذاہب اور تمدن کی افہام وتفہیم کی گراں قدر کوشش، مجلہ معارف، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ستمبر ۲۰۱۶ء، ۱۰۹-۱۰۷؛ قاضی اطہر مبارکپوری، خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان، ص: ۱۰۱

(۳) ایم۔ ایس۔ ڈیمنڈ، مسلمانوں کے فنون، ص: ۵۳-۵۲

(۴) ابن ندیم الوراق، الفہرست، ص: ۴۰۰-۳۹۹

متکلم اور مؤرخ جاحظ نے نجوم، حساب ،خطاطی،طب،رنگ سازی، تعمیرات،اسلحہ سازی،موسیقی ،آلاتِ موسیقی،شاعری،فلسفہ ،ادب، پکوان اور صرافہ کے عُلوم وفنون سے متعلق یہاں کے لوگوں کی بے پناہ صلاحیتوں کی تعریف کی ہے۔[۱]

عباسی خلفا کے اہلِ ہند سے خصوصی تعلقات کا اندازہ مختلف واقعات سے ہوتا ہے مثلاً ہندوستان کے ایک راجہ نے ہارون الرشید کو قیمتی تحائف بھیجے ،ان میں زمرد کی ایک چھڑی ایک گز سے زیادہ لمبی تھی،اس کے سرے پر یاقوت سرخ کی ایک چڑیا بنی ہوئی تھی جو بے حد لطیف و نازک تھی ،ہارون الرشید نے یہ چھڑی اپنی زوجہ امِ جعفر زبیدہ بنتِ جعفر (م۲۱۶ھ) کو دی جو وراثت میں منتقل ہو کر امین (م۱۹۸ھ) کے پاس آئی ،پھر اس کے بھائی مامون کو ملی اور پھر معتصم باللہ کے قبضہ میں آئی۔[۲] علاوہ ازیں ہندوستان کے ایک دوسرے راجہ نے مامون کو خوب صورت ہاتھی کا تحفہ بھیجا ،یہ وہی ہاتھی تھا جس پر عہدِ معتصم میں بابک خرمی کو مقامِ قاطول سے سامرا لایا گیا تھا۔[۳] اہلِ ہند پر عباسی خلفا کی عنایات کا اندازہ اس روایت سے بھی ہوتا ہے جس کے مطابق خلیفہ معتصم کے زمانے میں عمران بن موسیٰ برمکی جب امیر سندھ بنا تو اس نے بیضا نامی شہر آباد کیا۔یہ شہر فوجی چھاؤنی کی سی حیثیت رکھتا تھا۔[۴] اہلِ ہند کے ساتھ یہ خصوصی سلوک اس تاریخی حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ عباسیوں نے ہندی مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ ہندی تہذیب و معاشرت کو بھی بڑی قدر واہمیت سے نوازا۔ اعلیٰ عہدوں کی تفویض ،ترجمہ کی سرگرمیوں میں متحرک کردار، قیمتی تحائف کے تبادلے اور نئے شہروں کی تعمیر نے اہلِ ہند کو پُرعزم اور پُر اعتماد بنا دیا تھا۔ان دوستانہ و برادرانہ تعلقات نے ہندی تہذیب کو وہ تمام مواقع فراہم کیے جن کے ذریعے وہ عالم گیر اسلامی تہذیب کا باوقار حصہ بن گئی۔

درج بالا مباحث سے اسلامی تہذیب کے اُن عناصر کی وضاحت ہوتی ہے جن میں دوسری تہذیبوں کے عناصر کی آمیزش ہے۔اگرچہ مسلمانوں نے کشادہ دلی سے ایرانی، فرانسیسی، ترک ،رومن، ہندی کے علاوہ قدیم یونانی

---

(۱) جاحظ،رسالہ فخر السودان علی البیضان، مصر، ۱۳۲۶ء، ص:۸۱؛سید سلیمان ندوی، عرب وہند کے تعلقات، ص: ۱۲۸-۱۲۶

(۲) قاضی رشید بن زبیر، کتاب الذخائر والتحف، شمنصہ مطبۃ الحکومۃ، الکویت، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۰

(۳) المسعودی، مروج الذھب و معادن الجواھر، ج:۳، ص:۵۵۰

(۴) البلاذری احمد بن یحییٰ بن جابر، فتوح البلدان، مکتبۃ النھضیۃ المصریۃ، القاھرہ، ۲۰۱۰ء ج:۳، ص:۵۴۵

اور سریانی تہذیبوں سے استفادہ کیا لیکن یہ عمل نقل تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں مطالعہ، تفہیم، تحلیل اور تجزیہ بھی شامل تھا۔ اسی تحلیل و تجزیہ کے بعد اِن معاصر اور قدیم تہذیبوں کے بعض عناصر کو تازہ کاری اور اختراع کے ذریعے اسلامی تہذیب کا حصہ بنایا گیا۔ مسلمانوں نے عقلی علوم میں دوسری تہذیبوں سے استفادے میں کوئی بخل نہیں کیا لیکن نقلی علوم یعنی قرآن و سنت میں اُن کا مرکز، مرجع اور مصدر وحی ہی تھی۔ قرآن و سنت میں جن علوم کی ممانعت نہ تھی اُن میں استفادہ اور تازہ کاری نسبتاً زیادہ اور بھرپور ہوئی۔

۴۔ خاتمہ

اس مقالہ میں پیش کی گئی آرا کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ تہذیب کے اجزاے ترکیبی میں مذہب، علم و فن، سیاست اور اقتصادیات سمیت بہت سے عناصر شامل ہیں۔ یہ ایک مسلسل و اکتسابی عمل ہے جس میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں، اس لیے تہذیب و تمدن کی بہترین تشکیل کے لیے تعلیم و تربیت، آزادانہ تبادلۂ فکر و خیال اور باہمی استفادہ بہت ضروری ہے۔ تہذیبی ارتقا کا آغاز نسلِ انسانی کے ابتدائی دور سے ہی ہو گیا تھا، جس میں مختلف مذاہب اور مختلف علاقوں کے لوگوں نے مفید کردار ادا کیا۔ اس اعتبار سے اسلامی تہذیب ایک زمانی تسلسل کا نام ہے یعنی یہ ایک دائمی و ابدی تہذیب ہے جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا اور اس ضمن میں آخری رہ نمائی حضرت محمد ﷺ نے فراہم کی۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے انسانوں کے فکر و عمل میں ایک واضح تبدیلی آ گئی۔ عقیدہ، طریقۂ عبادت، رسم، رواج، لباس اور کھانے پینے کے آداب و انداز سمیت بہت کچھ بدل گیا۔ اسلامی تہذیب انسان دوست اور غیر متعصّبانہ ہے اس تہذیب نے قدیم تہذیبوں اور مختلف مذاہب کے صالح عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ مثلاً سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے عین مطابق کُفر، زنا، چوری اور قتل کے اقدامات کو روکا گیا، عربوں کی سُود جیسی جاہلانہ رسم کو بھی ختم کرنے کا درس دیا گیا، اس کے برعکس عرب جاہلیت میں ہی موجود خراج، وصیّت اور میراث کے بعض اُصول قبول کر لیے گئے۔ تہذیب و تمدن کا براہِ راست تعلق مذہب سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے اساسی نظریات قرآن و سنت سے مأخوذ ہیں، لہٰذا تہذیبی مفاہمت، اخذ، عطا اور اختراع کے عمل میں اسلامی تعلیمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عہدِ بنی عباس اس نظریاتی پسِ منظر میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور کے تہذیبی مظاہر نے مسلمانوں کی اس نظریاتی حیثیت کو غیر معمولی طور پر واضح کر دیا۔ اسلامی تہذیب و تمدن میں وُسعتِ نظری، اختراع اور تازہ کاری کے مختلف تصورات کی تفہیم کے لیے عباسی دور کی علمی

وثقافتی سرگرمیوں کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔اس مخصوص عہد میں بین المذاہب تعلقات، بین الاقوامی تجارت، فنِ ترجمہ کے ارتقا اور مختلف مذاہب سے وابستہ ماہرینِ علم وفن کی خدمات سے استفادے کی تاریخ اس حقیقت کی غماز ہے کہ مسلمان تہذیبی تصادم کے بجائے مفاہمت، ہم آہنگی، بامقصد مکالمہ، باہمی اخذ وعطا اور ثقافتی تازہ کاری کے خواہاں رہے ہیں۔